قوموں پر اللہ کا عذاب: فکر صحیح سے محرومی

میراتھن دوڑ تاریخ وتحقیق کی روشنی میں

علماء کرام ٹی وی پر کن سے مکالمہ کر رہے ہیں

۴۹۰ قبل مسیح میں یونان کے مقام میراتھن [Marathon] پر یونانی اور ایرانی فوج کی جنگ میں یونانیوں کی فتح کی خبر دینے کے لیے ایک سپاہی شدت جذبات سے ایتھنز کی طرف دوڑ نے لگا۔ اس دور میں مواصلات کی سہولتیں ناپید تھیں۔ لہٰذا سپاہی نے ایتھنز تک ۲۵ میل کا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کیا بھوک پیاس سے بے پرواہ یہ فاتح یونان کے شہریوں کو اس فتح کی خبر سنانے کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر دوڑ رہا تھا یہ دوڑ محض مادی جذبات کا اظہار نہ تھی بلکہ دوڑنے والا ایک مذہبی جذبے کے تحت دوڑ رہا تھا کیوں کہ یونان جو دیو مالائی تہذیب کا حصہ تھا کسی الہامی کتاب سے وابستہ نہ تھا اور یونانیوں کی زندگی کو روحانی لطافتوں سے پیوستہ رکھنے کے لیے یونانی دانشوروں نے کھیل کو ایک مذہبی اور روحانی ذریعہ بنا دیا تھا جس کے ذریعے وہ عبادت کا فریضہ انجام دیتے اور زندگی میں معنویت پیدا کرتے۔ یونانی سپاہی کا میراتھن سے ایتھنز تک دوڑنا دراصل اسی روحانیت، مذہبیت اور زندگی کی معنویت کا اظہار تھا جس کے مطابق یونانی قوم کھیلوں [sports event] کو نہایت اہمیت دیتی تھی اس عہد کی روحانیت جمالیات فنون لطیفہ کھیلوں اور لہو ولعب میں اپنا اظہار کرتی تھی۔ وہ مختلف دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے کھیل تماشوں کا انعقاد کرتے لوگوں کو ان کھیلوں کے ذریعے متحرک کیا جاتا ان میں زندگی کی تب وتاب اور چمک روشن رکھی جاتی۔ وہ خدا کو خوش کرنے کے لیے بھاگتے دوڑتے جو دوڑ میں سب سے آگے نکل جاتا وہ یونانیوں کے خدا کا خالص بندہ ہوتا اور روحانیت میں سب سے آگے ہوتا۔ مذہب کی جگہ کھیل تماشے تھے یونانی تہذیب میں کھیلوں کی بے پناہ اہمیت کا سبب اس روحانی خلاء کو پر کرنا تھا جو الہامی مذہب کی عدم موجودگی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا تاکہ لوگوں کی جذباتی زندگی کو مطمئن کرنے کے لیے ایک راستہ فراہم کیا جائے۔

میراتھن دوڑ اس عہد، اس تہذیب، اس جنگ کی یادگار ہے جو ۴۹۰ قبل مسیح میں میراتھن کے مقام پر لڑی گئی۔ یونانیوں کے یہاں اس جشن کو صدیوں تک منایا جاتا رہا لیکن یونانی تہذیب کی شکست وریخت کے نتیجے میں یہ دوڑ ماضی کا حصہ بن گئی۔ ۱۸۹۶ء میں میراتھن دوڑ کا احیاء کیا گیا اور یونانی کھلاڑی اِسپیریدون لُوئیس SpyridonLouis اس دوڑ کا فاتح تھا ۱۹۲۴ء سے میراتھن دوڑ کو عالمی اولمپک گیمز میں شامل کرلیا گیا اولمپک گیمز بھی یونانی دیوی اور دیوتاؤں کو خراج عقیدت پیش کرنے کا مذہبی جشن تھا۔ سترہویں صدی میں مغرب میں عیسائیت کے زوال کے ساتھ ہی یونانی فلسفے کا زوال بھی ہوگیا لیکن اصلاً مغربی فلسفے کی فلسفیانہ بنیادیں یونانی فلسفے پر ہی استوار کی گئی تھیں لہٰذا مغرب نے فلسفہ یونان کے ان امور کو جو اقدار و روایات Virtues سے متعلق تھے ان کو مسترد کردیا لیکن یونان کی عقلیات جمالیات اور روحانیت کے اظہار کھیلوں Sports کو مغربی فکر و فلسفے کا لازمی حصہ بنالیا کیوں کہ لہو ولعب اچھل کود کے ذریعے اس خلاء کو پر کیا جاسکتا تھا جو عیسائیت کے انخلاء سے پیدا ہوا تھا۔ مغرب میں کلیسا کی شکست قدیم اداروں کے خاتمے اقدار، روایات اور اجتماعیّتوں کو پارہ پارہ کرنے کے باوجود جدیدیت ان اداروں کا متبادل مہیا نہ کرسکی نہ ہی وہ قدیم اقدار و روایات کے متبادل نئی اقدار و روایات پیش کرسکی جس کے باعث فرد کی زندگی لایعنی Meaningless ہوگئی۔ لوگ زندگی سے اکتا گئے زندگی میں کوئی مقصدیت باقی نہ رہی، شکم اور فرج کی پرستش کہاں تک ہوتی زندگی صرف جسم کے دو حصوں کی خواہشات پورا کرنے کا نام تو نہیں لہٰذا زندگی کو معنویت عطا کرنے کے لیے [Meaningfull بنانے کے لیے] مغرب نے یونانی روحانیت جمالیات لہو ولعب، تفریحات اور کھیل کود کو ایک عالمگیر آفاقی ثقافتی ورثے کے طور پر متعارف کرایا تاکہ تنہا فردان کھیلوں میں ڈوب جائے اور زندگی سے مایوس نہ ہو۔ یہ کھیل اسے ایک ولولہ، حوصلہ، جذبہ تازہ، ایک نیا آہنگ، امنگ اور ترنگ مہیا کرسکیں اسی لیے مغرب میں اس وقت سب سے زیادہ سرمایہ کاری لہو ولعب و تفریحات کی صنعت [Entertainment Industry] اور جمالیات سے متعلق صنعتوں میں ہورہی ہے۔ اس عہد میں مغربی تہذیب کی روح نطشے سے برآمد ہوتی ہے، نطشے کو پاگل قرار دے کر پاگل خانے بھیجنے والے مغرب نے اب اس کے افکار کو اپنی زندگی بنالیا ہے۔ زندگی کو صرف جمالیات، جبلتوں خواہشات کی غلامی، آرزؤں کی تکمیل، تمناؤں کے تقاضے پورے کرنے تک محدود کردیا گیا ہے۔ مغربی تہذیب جبلتوں اور جمالیات تک محدود ہوگئی کھربوں روپے جمالیات کھیل تماشوں اور لہو ولعب کی صنعتوں میں لگادیے گئے ہیں تاکہ زندگی بے رنگ نہ ہو اس میں ہر رنگ ہو اور انسانیت روح کی پیاس بجھانے کے لیے خدا تک پہنچنے والے اداروں، اقدار، روایات اور رویوں سے کوسوں دور ہوجائے، وہ اپنی ذات میں مگن ہو اور لہو ولعب کی دنیا میں گم ہوجائے اس پر ایک ایسی بے خودی طاری ہو اور ایک ایسا نشہ چڑھ جائے کہ وہ اس دنیا سے بے خبر ہوکر اُس دنیا سے بھی بے پروا ہوجائے جو موت کے بعد منہ کھولے کھڑی ہے اور ہماری منتظر ہے۔ جو شخص اس دنیا میں ہوش وحواس سے کام لیتا ہے وہ آنے والی دنیا کے تصور سے کنارہ کش نہیں رہ سکتا اگلی دنیا کا تصور خالصتاً موت سے وابستہ ہے اور مغرب میں سب سے ناپسندیدہ چیز اور لفظ موت ہے اس لیے پوسٹ ماڈرن فلاسفہ کے یہاں موت کے سوال پر خاموشی ہے۔ پوسٹ

ماڈرن فلسفی مابعد الطبیعاتی سوالات پر مہر بہ لب ہیں موت کا تصور ان پر موت طاری کر دیتا ہے لہٰذا وہ موت کے خوفناک سوال کو.....ذہن سے محو کرنے کے لیے کھیل کود کی ثقافت، لہو ولعب کی ثقافت، راگ رنگ کی ثقافت، جمالیات اور جنسی آوارگی کی ثقافت میں لوگوں کو مسلسل اور مکمل مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔

مذہبی معاشروں کو مغرب فکری، فلسفیانہ وفطری بنیادوں پر شکست دینے میں ناکام رہا ہے تین سو سال سے مذہب کے خلاف مغرب کی عسکری، ثقافتی، فکری یلغار کام یاب نہیں ہو سکی لہذا تجربات نے انھیں سب سے موثر ہتھیار کے بارے میں بتا دیا ہے کہ ثقافتی یلغار اور لہو ولعب کی للکار کے ذریعے ہی مذہبی معاشروں کو شکست دی جاسکتی ہے۔ پاکستان میں میراتھن ریس اسی مغربی یلغار کا ایک نیا رخ ہے تاکہ کھیل کے نام پر لوگوں کو ایک دوسرے سے گتھم گتھا کر کے معاشرے کو اخلاقی قدروں سے آزاد کر دیا جائے۔ بسنت کا تہوار لاہور میں قدیم زمانے سے منایا جاتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں لاہور میں بسنت کے تہوار پر تعطیل ہوتی تھی لیکن یہ محض ایک مقامی تہوار تھا جسے مقامی لوگ مقامی طور پر مقامی طریقوں سے مناتے تھے لیکن سن دو ہزار میں یہ تہوار ایک عالمی تہوار میں تبدیل کر دیا گیا اور اس تہوار کی اس طرح تشہیر کی گئی جیسے کہ یہ ایک عالمگیر واقعہ ہو۔ اربوں روپے تین دن کے تہوار پر خرچ کیے جانے لگے اخبارات وجرائد لہو ولعب کی ثقافت کو عام کرنے میں کل پرزے بنے ہوئے تھے۔ تہوار کے دنوں میں پی آئی اے اور دیگر نجی ائیر لائنوں نے اپنے کرائے کم کر دیے تھے جبکہ یہی ائیر لائنز حج، عید، بقر عید کے موقع پر اپنے کرائے کم کرنے کے بجائے بڑھا دیتی ہیں کیوں کہ مذہبی تہواروں کی حوصلہ شکنی کرنا مغربی تہذیب کا خاص طریقہ کار ہے۔ ایسے موانع اور مشکلات پیدا کرنا کہ لوگ مذہبی تہواروں میں شرکت کا خیال چھوڑ دیں اور لہو لعب کے تہواروں کے لیے ایسی ایسی آسانیاں اور سہولتیں فراہم کرنا کہ لوگ شوق اور کثرت سے ان میں شرکت کریں۔ مذہبی تہوار لوگوں کو مذہب سے وابستہ کرنے پیوستہ رکھنے اور مذہبی بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لہذا ان تہواروں کی حوصلہ شکنی کا یہی طریقہ ہے مثلاً بقر عید کے موقع پر ارب پتی گھرانوں کے بچوں بڑوں سے لے کر غریب خاندانوں کے لوگوں تک سب یکساں مذہبی جوش و جذبے کے ساتھ قربانی کے جانوروں کے انتخاب، خریداری، قربانی کے گوشت کی تقسیم میں مصروف نظر آتے ہیں بظاہر یہ بہت معمولی کام لگتا ہے لیکن دس بارہ روز تک ایک کھرب پتی سے لے کر غریب آدمی تک عبادت کے ایک ایسے عمل میں مصروف ہوتا ہے جس میں اسے روحانی لذت کے ساتھ ساتھ جمالیاتی رنگ بھی ملتے ہیں اسے فطرت سے قریب ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی پیدائش میں فکر ونظر اور جمالیات کے کتنے رنگ پیدا کیے ہیں انسان کو اس پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے بچوں کو جانوروں کو چراتے ہوئے پیغمبروں کی اس سنت کے ذریعے فطرت سے قریب ہونے اور اس سنت پر عمل پیرا ہونے کا موقع ملتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان النفس وآفاق پر غور کرتا ہے۔ مسلمان کا جانوروں کو لے کر دور دور تک چلے جانا اسے فطرت اور مناظر فطرت سے قریب تر کر دیتا ہے۔ دھنک کے جل ترنگ، شفق کے رنگ، سورج کا ڈوبنا، شام کا آنا، رات کا چھا جانا، درخت پودے، پرندے گھاس پھوس جانوروں کا جائزہ، جانوروں کی فرماں برداری اور اطاعت کے مناظر اسے خالق کائنات کا بندہ بننے پر بخوشی آمادہ کر دیتے ہیں۔ یہ سفر

صرف سیر وتفریح کا سفر نہیں ہوتا اس سفر کے نتیجے میں انسان، بچہ، بوڑھا فطرت سے قریب ہو جاتا ہے اس سفر کے دوران کائنات کے اسرار ورموز پر غور وفکر کرنے کے عظیم مواقع کا ملنا انسان کے روحانی ارتقاء کا سبب بن جاتا ہے لہٰذا ان تہواروں کو اب حفظانِ صحت کے اصولوں کے خلاف باور کرایا جارہا ہے کہ جانوروں کی قربت [Unhygenic] ہے اسے ہاتھ نہ لگایا جائے گھر میں نہ رکھا جائے [اقوام متحدہ کے کوفی عنان کی اپیل کہ لوگ پرندوں کے ساتھ زندگی بسر نہ کریں برڈ فلو کا خطرہ ہے اربوں انسانوں کو اربوں سال سے جاری ایک طرز زندگی ختم کرنے کی حکمت عملی ہے تا کہ دیہی معاشرے کا خاتمہ کر کے ملٹی نیشنل کمپنیوں کو پرندوں کے گوشت اور دودھ کا نظام سپرد کر دیا جائے کہ وہی حفظان صحت کے اصولوں کے تحت یہ اشیاء مہیا کر سکتے ہیں یہ کام عام انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے] مختلف تنظیمیں میدان میں آ گئی ہیں جو آپ کو قربانی کے اس پورے روحانی جمالیاتی عمل سے محروم کر کے گھر بیٹھے کٹا کٹایا صاف ستھرا گوشت مہیا کرنے کی مدعی ہیں اس سہولت کے نتیجے میں لاکھوں لوگ قربانی کے ان روحانی فیوض وبرکات سے محروم ہوتے جارہے ہیں جو منڈی میں جانوروں کی تلاش سے شروع ہو کر عید کے دن جانور کی گردن پر چھری پھیرنے تک بے شمار ایمانی اور روحانی سرچشموں کا مرکز ہے۔ جانوروں کی گردن پر چھری پھیرنا اور خون بہانا صرف سنتِ ابراہیمی کی یاد نہیں بلکہ اس جہادی عمل کی عملی تربیت ہے کہ اگر اسلام پر مشکل وقت پڑے تو یہ تربیت میدان جہاد میں خون دیکھ کر خوف کا شکار ہونے کے بجائے ایک نیا ولولہ پیدا کر دیتی ہے۔

کھیلوں کو مغربی تہذیب وثقافت میں جو بنیادی اہمیت حاصل ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ انسانی حقوق کی تنظیمیں، ہیومن رائٹس آف پاکستان اور NGOs نے آج تک لاہور میں بسنت کے موقع پر پتنگوں سے کٹ کر مرنے والوں کے لیے کبھی قانونی جنگ نہیں لڑی نہ کبھی بسنت پر پابندی کا مطالبہ کیا۔ علماء کرام نے کبھی انسانی حقوق کے دعوے داروں سے یہ سوال نہیں کیا کہ پنجاب میں ہزاروں بچے عورتیں شدید زخمی ہوتے ہیں ڈوروں سے کئی بچوں کی گردنیں کٹ جاتی ہیں۔ چھت سے گرنے کے ہزاروں واقعات ہوتے ہیں لیکن پاکستان کی کسی NGO کسی حقوق انسانی کی تنظیم حتی کہ دنیا کی کسی حقوق انسانی کی تنظیم نے پتنگ بازی پر پابندی کا مطالبہ نہیں کیا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ لہو ولعب کھیل تماشے مغربی فکر وثقافت کا زبردست اظہار ہیں۔ اس اظہار کے دوران اگر لوگوں کو نقصان پہنچے تو کوئی حرج نہیں مغرب میں وہ شخص انسان ہی نہیں جو زندگی کو لہو ولعب پر ترجیح دے اصل زندگی تو لہو ولعب وکھیل وتماشہ ہے مرنا تو ایک دن ہے لیکن سیر سپاٹے اور عیاشی کرتے ہوئے مرنا کوئی بری بات نہیں۔ اسی فلسفے کے تحت میراتھن دوڑ کو دین وایمان کا مسئلہ بنالیا گیا اور یونانی تہوار کو پاکستان پر مسلط کرنے کے لیے پوری طاقت استعمال کی گئی افسوس ہے کہ مذہبی طبقات اور مذہبی تحریکوں نے میراتھن ریس کے سلسلے میں فکری وعملی کام کرنے کے بجائے حسب معمول صرف احتجاجی بیانات پر اکتفا کیا، میراتھن ریس پر پنجاب حکومت کے اس قدر اصرار کا فلسفہ سمجھے بغیر اس قسم کے مغربی مظاہر کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ مغرب سے مقابلے کے لیے مغرب کے فکر وفلسفے سے واقفیت ضروری ہے تا کہ دشمن کا مقابلہ کرنے سے پہلے دشمن کے طرز فکر فلسفے اور ہتھیاروں سے بخوبی

واقفیت ہوجائے، صرف نعرے بازی، جذباتی بیانات سے کچھ نہیں ہوگا، جذبات اور اقدام کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن یہ جذبات اور اقدام اگر شعور کی دولت سے عاری ہوں تو ان میں نہ استحکام پیدا ہوتا ہے نہ ان کا اثر نظر آتا ہے۔ صرف شور شرابے کے ذریعے اس طرح کے کاموں کو روکا نہیں جاسکتا۔ اس کے لیے فکری، علمی اور عملی کام نہایت خاموشی کے ساتھ مناسب موقع پر کرنے کی ضرورت ہے۔ گزشتہ سال گوجرانوالہ کی حکمت عملی اس سال لاہور میں ناکام ہوگئی۔ تمام تر دعووں، ہنگاموں اور شور شرابے کے باوجود آخر کار میراتھن ریس منعقد کی گئی۔ دعوے کرنے والے منہ دیکھتے رہ گئے۔ پاکستانی معاشرے میں جس تیزی سے مغربی فکر کی روشنی میں تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں ان پر گہرے غور وفکر وتدبر کی ضرورت ہے۔ ایک جانب مذہبی فکر حقوق انسانی کے منشور کو تسلیم کرچکی ہے اگر یہ منشور درست ہے تو اس کے تحت عورت ومرد برابر ہیں۔ اگر برابر ہیں تو ان کے حقوق بھی برابر ہیں۔ اس منشور کے تحت کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر برتری حاصل نہیں۔ اصل مذہب انسانیت ہے، انسانوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ انسان آزاد ہے اسے کسی خاص ضابطے کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ مذہبی عناصر ان تمام مغربی اقدار کو تسلیم کرچکے ہیں تو انھیں میراتھن ریس پر اعتراض کرنے کا حق کیا ہے؟ جب یہ اقدار عالمی ہیں تو ان اقدار کے تحت میراتھن ریس کی ثقافت ہی عام ہوگی۔ لہٰذا سب سے پہلے مغربی فکر وفلسفے کو مسترد کرنے کی ضرورت ہے۔ اس فلسفے کو مسترد کرنے کے نتیجے میں مغربی فکر وفلسفے کے تمام آثار ومظاہر کے انسداد کی جامع حکمت عملی مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ لاہور میراتھن میں بائیس ہزار لوگوں کی شرکت ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ یہ واقعہ اس بات کی شہادت ہے کہ پاکستانی معاشرے پر مذہبی عناصر کی گرفت کمزور ہورہی ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ روحانیت میں کمی بھی ہے۔ گزشتہ دو عشروں میں میڈیا کے ذریعے مذہب کے فروغ کی زبردست کوشش کی گئی لیکن روحانیت پر اس قدر توجہ نہیں دی گئی۔ زاہدوں وعابدوں کی طرف خلق کثرت سے رجوع ہوتی ہے۔ لیکن ہم نے مقررین، خطباء، دانشوروں، صحافیوں کی بہت بڑی فوج تیار کی ہے جو عوام کے علمی وفکری ذوق کی تسکین تو کرتی ہے لیکن ان کی روحانی پیاس نہیں بجھا سکتی، یہ پیاس دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے اور متبادل کے طور پر عوام اب میلوں ٹھیلوں، ڈراموں، کھیلوں، کنسرٹ، رقص وسرود میں مصروف ہوگئے ہیں۔ مذہبی لوگوں کے لیے ثقافتی اسلام آسان راستہ ہے، ڈسکو، کنسرٹ، آلات موسیقی کے طرز پر نعتیں ڈھالی جارہی ہے اور بڑے پیمانے پر سنی جارہی ہیں۔ یہ انحطاط ہمارے ذہنی انحطاط کی علامت ہے۔ یہ المیہ ہے کہ روحانی شخصیات سے ہمارا دامن خالی ہے، جن کی صحبت لوگوں کو بدل سکے۔ انسان کو صرف اچھی صحبت بدل سکتی ہے کوئی آلہ ذریعہ نہیں۔

میراتھن کے موضوع پر ٹی وی چینلز کے ذریعے علماء اور اس بازار کی عورتوں اور فلم وثقافت سے وابستہ اداکاروں اور اداکاراؤں کے مابین مکالمے اس ذہنی بحران اور فکری خلجان کو واضح کرتے ہیں جو امت مسلمہ کو درپیش ہے۔ آزادی اظہار رائے کی مغربی اصطلاح سے ناواقف مذہبی شخصیات ٹی وی پر اداکاراؤں، اور عام سطح کی شخصیات سے مکالمہ میں مصروف تھیں۔ کیا ہر فرد وبشر کو آزادی ہے کہ وہ دین کے معاملات، عبادات، عقائد، فقہ پر گفتگو کرسکے۔ خواہ وہ اس کی اہلیت، قابلیت اور علمیت کا حامل ہو یا نہ ہو۔ کیا ٹی وی والے سائنس، معاشیات،

عالمی حالات کے کسی پروگرام میں کسی اداکار یا اداکارہ کو شریک کرتے ہیں۔ صرف مذہبی پروگرام میں مذہب سے لاتعلق غیر ماہرین کی شرکت کا مطلب مذہب کو مذاق بنانے کے سوا کیا ہے؟ وہ طبقات جو آج کے لبرل معاشرے میں بھی ناپسندیدہ، حقیر اور بے توقیر سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے علماء ٹی وی پر ان سے مباحثے میں مصروف تھے۔ اور ثابت کر رہے تھے کہ میراتھن اسلام میں جائز نہیں۔ یہ مکالمہ علماء کی بہت بڑی شکست ہے۔ مکالمہ اور آزادی اظہار رائے کا مطلب یہی ہے کہ ہر ایرا غیرا جس نے دین کا کبھی مطالعہ نہیں کیا۔ دین پر اعتراضات اٹھا دے اور علماء ان کے جواب دیں۔ لہٰذا ان مباحثوں میں بار بار یہ سوال دہرایا گیا کہ آخر میراتھن دوڑ میں کیا ہرج ہے، آخر حج وعمرے کے موقع پر طواف کعبہ کے وقت بھی تو عورتیں دوڑتی ہیں۔ حضرت ہاجرہ بھی تو پانی کی تلاش میں دوڑ رہی تھیں۔ صفا و مروہ میں سعی تو اس دوڑ کی روحانی علامت ہے۔ یہ پستی فکر کی انتہا یہ ہے کہ یونانی دیومالا سے نکلنے والی میراتھن دوڑ کو حج وعمرہ کی مقدس ترین عبادات کے مناسک سے جوڑ دیا گیا ہے۔ آزادی اظہار رائے اور مکالمے کی مغربی اصطلاح کا صرف اور صرف یہی مطلب ہے۔ کہ دین کو حقیر ٹھہرایا جائے اور آزادی کے نام پر ہر ایک کو اعتراض کا موقع دیا جائے، اعتراض اور استفسار میں فرق ہے، استفسار کا مقصد الجھن کو حل کرنا اور اعتراض کا مقصد اپنے علم پر غرور اور دین کو غلط سمجھنا ہے۔ اسلام میں الجھن کے لیے استفسار کی اجازت ہے۔ اعتراض کرنے کی نہیں استفسار لاعلمی سے علم کا سفر ہے۔ مغرب اپنے ایجنڈے میں کامیاب ہے۔ ہمارے علماء کرام ان مباحث کی ماہیت اصلیت حقیقت سے بے خبر ہیں۔ یہ سادہ لوح علماء سمجھتے ہیں کہ ہم دین کی خدمت کر رہے ہیں گمراہ لوگوں کو سمجھا رہے ہیں ٹی وی کے ذریعے دین کی نشر واشاعت کر رہے ہیں وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں [ٹی وی کے جمالیاتی پنجرے کی اثر آفرینی کے دلی طور پر اکثر جدیدیت پسند علماء قائل ہیں] کہ اس ٹی وی نے دین کو مضحکہ بنا دیا ہے اور اس سے زیادہ مضحکہ خیز صورت حال یہ ہے کہ علماء ان مقامات پر دینی فریضہ سمجھ کر اپنے وجود کا احساس دلا رہے ہیں جہاں سے ان کا اٹھ جانا ضروری ہے۔ علماء کا مذاکرہ اور مباحثہ علماء سے ہو تو کوئی حرج نہیں لیکن علماء، جاوید اقبال جیسے اسلام دشمن مفکر کسی اداکار، اداکارہ، شوبزنس کی شخصیت، سیکولر دانشوروں، ادھر ادھر سے بلائے گئے نام نہاد علمی شخصیات سے مکالمہ کر رہے ہیں جو دین کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے اور اسلام کی مابعد الطبیعیات علمیات کونیات اور وجودیات کے منکر ہیں۔ مکالمہ برابر کی سطح پر ہوتا ہے، ان لوگوں سے ہوتا ہے جن کا منہاج علم وفکر یا جن کی مابعد الطبیعیات وجودیات علمیات کونیات یکساں ہوتی ہیں۔ مکالمہ اپنی سطح کے فرد سے ہوتا ہے اس بازار کے لوگوں سے نہیں، تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک موضوع سے لاتعلق فرد کو اس موضوع پر گفتگو کے لیے بٹھا دیا جائے۔ علماء کرام نے مغرب کے دام ہمرنگ زمین کو نہیں پہچانا وہ اس پنجرے میں چلے گئے ہیں جہاں ان کے بال و پر کاٹ لیے گئے ہیں۔ مشہور امریکی دانشور نام چومسکی نے مشہور مغربی فلسفی فوکالٹ سے انٹرویو کرتے ہوئے جب یہ سوال پوچھا کہ what is human nature۔

تو فوکالٹ نے جواب دیا کہ نوم چومسکی تمہیں یہی نہیں معلوم کہ تم کس سے گفتگو کر رہے ہو تمہیں سوال پوچھنے کا طریقہ بھی نہیں آتا۔ تم مشعل فوکالٹ سے گفتگو کر رہے ہو تو فوکالٹ کے فکر وفلسفے کے منہاج کے

مطابق سوال کرو۔تمہارا سوال ہی غلط ہے تم سوال کو از سرِ نو تشکیل دو تمہیں یہ سوال مجھ سے نہیں پوچھنا چاہیے تم مجھ سے صرف یہ پوچھ سکتے ہو کہ How human nature is construct in the western civilization نام چومسکی مغرب میں ایک بہت اہم نام ہے۔وہ دنیا کی اہم ترین یونیورسٹی کا پروفیسر ہے اس کی بے شمار کتابیں اور سیکڑوں مقالات شائع ہو چکے ہیں لیکن وہ جب فوکالٹ سے ہم کلام ہوا تو فوکالٹ نے اسے گفتگو کا طریقہ سکھا دیا۔اسے بتا دیا کہ جس موضوع پر گفتگو کرو اس موضوع کی مابعد الطبیعات سے واقفیت حاصل کرو اور پھر اس تناظر میں سوال اٹھاؤ۔افسوس یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام میں اتنی جرت نہیں ہے کہ وہ ٹی وی کے پست ترین میزبانوں کو جرأت سے ٹوک دیں اور ان سے کہہ سکیں کہ تم کس سے بات کر رہے ہو،تم کیا کہہ رہے ہو، تم کیا پوچھ رہے ہو،تمہاری یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم اسلام کے منہاج میں دوسرے منہاج کے سوالات اٹھا دو یہ جرأت صرف اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب کفر کا علم حاصل ہو جب تک مغرب کے کفر سے واقفیت نہ ہو تو کافرانہ سوالات بھی اسلامی لگتے ہیں اور علماء مکالمے،مباحثے تبادلۂ خیال آزادی اظہار رائے کے نام پر مغرب کے بنائے ہوئے طلسمی پنجرے اور پھیلائے ہوئے خوبصورت جال میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔اس طرح کے مکالمے میں اگر شرکت کرنا ضروری بھی ہو تو گفتگو کا ڈھنگ وہی ہونا چاہیے جو فوکالٹ نے اختیار کیا۔

مغرب میں عیسائیت کو شکست دینے میں مغربی فکر و فلسفے کو تین سو برس لگے،سائنس و ٹیکنالوجی اور مغربی فکر و فلسفے کے عروج کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پوپ پال یا عیسائی علماء اور راہبوں نے ڈاکٹر جاوید اقبال جیسے دانشوروں اور قلمی اداکاروں سے مباحثے و مناظرے کئے ہوں،ان عیسائی علماء کا ایک خاص وقار اور علمی روحانی مقام تھا وہ اپنے ہم پلہ فلسفیوں سے ہم کلام ہوتے تھے۔مغربی فکر و ثقافت کی یلغار کے بعد ایسا نہیں ہوا کہ عیسائیت کلیسا سے براہ راست کنسٹرٹ یا جمالیات پر آ گئی ہو،عیسائیت کو اس مقام پر آنے میں تین صدیاں لگیں۔چرچ نے مکالمہ لائبنز ڈیکارٹ، گیلی لیو، نیوٹن، کانٹ کر کے گارڈ کی سطح کے لوگوں سے کیا۔یہ نہیں کہ دو دو ٹکے کے دانشور جو اپنے کفر کا کھلم کھلا اعلان کرتے ہیں۔ان سے اسلام پر مذاکرہ کیا جا رہا ہے۔عیسائیت کی گزشتہ تین سو برس کی تاریخ میں پوپ پال نے کبھی کسی مغنی، رقاص، ہیجڑے، پھکڑ باز، پھبتی باز، ایرے غیرے سے مناظرے و مکالمے نہیں کیے، ہر کہہ و مہہ کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اسلام پر حملہ آور ہو اور اسلام پر اعتراضات کرے،آزادی اظہار رائے کو ماننے والے علماء کو اب اسی صورت حال کا سامنا ہے جو اسلام کی تصویر کو مسخ کرنے کا باعث بن رہی ہے۔

جاوید احمد غامدی صاحب جیسے جدیدیت پسند اور مغرب نواز دانشوروں سے گفتگو کرتے ہوئے علماء کرام کو پہلا سوال یہ پوچھنا چاہیے کہ وہ کس مابعد الطبیعات ،علمیات اور وجودیات کے قائل ہیں، ان کے ماخذات دین کیا ہیں کیا وہ اسلام کو الحق ،قرآن کو الکتاب،اور اسلام کو آخری حق و سچ مانتے ہیں یا نہیں؟ غامدی صاحب تو فرماتے ہیں کہ میں بدھ مذہب سے مکالمہ کروں گا اگر وہ مجھے قائل کر دے گا تو میں بدھ ازم قبول کر لوں گا ۔جو شخص اسلام کو آخری حق اور سچ نہیں سمجھتا اس سے اسلام کے موضوع پر گفتگو کرنا بہت بڑی نادانی ہے۔غامدی

صاحب جس عقلیت کی بنیاد پر حق قبول کرنے کی بات کررہے ہیں وہ مغربی عقلیت ہے جو سترہویں صدی میں شروع ہوئی لیکن اس عقلیت کی کمزوریاں اور کوتاہیاں مغرب کے سامنے واضح ہوگئیں تو مغربی تہذیب ماڈرن ازم سے پوسٹ ماڈرن ازم کے دور میں داخل ہوگئی۔اور پس جدیدیت نے جدیدیت کے ان تمام دعووں کا انکار کردیا کہ عقل کی بنیاد پر عالمی آفاقی اقدار تیار کی جاسکتی ہیں پاکستانی معاشرے میں جدیدیت کا بڑھتا اور چڑھتا ہوا سیلاب دینی اقدار وروایت کو تیزی سے مٹا رہا ہے۔علمائے کرام مذہبی جماعتوں، دینی تحریکوں کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے۔مختلف اداروں میں اسلام دشمن افراد کو تعینات کیا گیا ہے لیکن مذہبی حلقے مہر بہ لب ہیں یہ سکوت نہایت خطرناک ہے قوموں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب محرومی فکر صحیح کی صورت میں نازل ہوتا ہے۔اسی لیے انبیاء جب بھی آتے ہیں سب سے پہلے فکر کو صحیح کرتے ہیں جس کے نتیجے میں عمل بھی صحیح ہوجاتے ہیں۔اور ایک نیا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو قدیم اقدار وروایات معاشروں کو تہس نہس کرکے ایک نئے عہد کی بنیاد رکھتا ہے۔جب قوم کی رہنمائی کرنے والے خود رہنمائی اور فکرِ صحیح سے محروم ہوجائیں تو وہ دوسروں کی کیا رہنمائی کریں گے۔عالم اسلام، پاکستان، امت مسلمہ عذاب کی کیفیت میں ہے۔مگر اسے اس کا اندازہ ہی نہیں ہے۔

اس میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں کہ وہ علماء جو انگریزی سے ناواقف ہیں وہ آج بھی صراط مستقیم پر ہیں اور نہایت راسخ العقیدہ ہیں۔لیکن وہ علماء جو انگریزی لکھ، پڑھ اور بول لیتے ہیں اور دو چار مغربی ممالک کے دورے کرلیتے ہیں وہ مغرب سے اس قدر مرعوب ہوجاتے ہیں کہ سارا مغرب اسلام سے درآمد کرنے لگتے ہیں۔مستشرقین راسخ العقیدہ علماء سے اپنے مطلب کی بات کہلوانے کا فن جانتے ہیں خصوصاً ان علماء سے جو انگریزی تو جانتے ہیں لیکن جدید مغربی علوم وفلسفہ سے قطعاً ناواقف ہیں] انھیں معلوم ہے کہ علماء مغربی فلسفہ، مغربی علوم، جدید سائنس کے مباحث سے واقف نہیں ہیں لہٰذا وہ اس ناواقفیت کا فائدہ اٹھا کر ان تک مختلف ذرائع سے پہنچتے ہیں اور نہایت سادہ لوح سائل بن کر اپنے سوالات کے جال میں علماء کو قید کرکے اپنے مطلب کے جوابات حاصل کرلیتے ہیں۔یہ طریقہ ایران میں سب سے زیادہ رائج ہے وہاں مستشرقین خصوصاً فرانسیسی مستشرقین علماء ومشائخ کے پاس استفادے کے لیے پہنچ کر اپنے سوالات ایسے الفاظ میں پیش کرتے ہیں جن کا صحیح مفہوم اور پس منظر علماء پوری طرح نہیں سمجھ سکتے پھر وہ مستشرق علماء کے جوابات کو اپنی تائید کے لیے استعمال کرتے ہیں اس کی مثال فرانس کے مستشرق آنری کوربان (Henry Corbin) کی ہے وہ ہر مسئلے میں یہی دعویٰ کرتے تھے کہ میں نے ایران کے علماء اور مشائخ سے دریافت کرلیا ہے ایرانی علماء میں اثر ورسوخ کے باعث تصوف ومعقولات کی کتابوں کی طباعت کا کام بھی حکومت نے ان کے سپرد کردیا تھا۔

روس اور بھارت میں کیا فرق ہے؟

سعودی عرب کے ملِک عبداللہ بن عبدالعزیز نے تجویز دی ہے کہ بھارت کو تنظیم اسلامی کانفرنس

میں مبصر کا درجہ دیا جائے۔ بھارت اس قسم کا مطالبہ خود کئی بار کر چکا ہے کہ وہ سب سے بڑی مسلم اقلیت کا ملک ہے اس کا یہ بھی مطالبہ تھا کہ او آئی سی نے روس جیسے کمیونسٹ ملک کو اس تنظیم میں مبصر کا درجہ دے رکھا ہے تو بھارت کا کیا جرم ہے؟ اصولی طور پر یہ مطالبہ اور شاہ عبداللہ کی تجویز بے ضرر نظر آتی ہیں لیکن ان امور کی تہہ سے واقفیت رکھنے والے مدبر سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنا خطرناک مطالبہ ہے بعض دانشوروں نے بھارت کو مبصر کی حیثیت دینے کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ روس اور بھارت میں بہت بڑا فرق ہے؟ جسارت کے مطابق روس میں آباد مسلمانوں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جارہا جو بھارت میں ہو رہا ہے۔ اس دلیل کی لغویت خود عیاں ہے سب سے پہلے تو یہ بتایا جائے کہ روس اور بھارت میں کیا فرق ہے جس طرح بھارت کو مبصر کا درجہ دینا ٹھیک نہیں اس طرح روس کو یہ مقام دینا بھی غیر دانش مندانہ فیصلہ تھا افسوس کہ کسی نے اس کی مذمت نہ تب کی نہ اب۔ روس نے مسلمانوں پر جو کچھ مظالم کیے اس کی طویل تاریخ ہے اتنی آسانی سے محض یہ کہہ دینا کہ روس اور بھارت میں بہت فرق ہے ایک غلط استدلال ہے افسوس کہ ہم اپنی تاریخ سے اس حد تک ناواقف ہوگئے ہیں کہ ایک شیطان کو دوسرے پر ترجیح دینے لگے ہیں۔

یہ بے حسی کیوں ہے؟

ستمبر اور اکتوبر کے ڈان میں کوپن ہیگن میں توہین رسالت کے مبنی کارٹونوں کے سلسلے میں خبریں مسلسل شائع ہوتی رہی ہیں لیکن اردو اخبارات ان خبروں سے لاتعلق رہے اور دینی جماعتیں بھی اس معاملے سے لاعلم رہیں ساحل نے نومبر ۲۰۰۵ء کے شمارے میں سرورق کے پشت کے صفحے پر اس اہم مسئلے کی جانب علماء، دینی جماعتوں اور مذہبی تحریکوں کو متوجہ کیا لیکن ہر طرف خامشی رہی۔ ۲۱/ اکتوبر کے ڈان کی خبر کے مطابق مسلمان سفیروں نے توہین آمیز کارٹونوں کی اشاعت پر احتجاج کیا تھا اور اس احتجاج میں پاکستانی سفیر بھی شامل تھے لیکن پاکستان کی مذہبی جماعتوں کی جانب سے فروری تک کوئی احتجاج نہیں کیا گیا۔

خبر کا متن درج Muslim envoys protest against blasphemous sketches ذیل ہے۔

Openhagen, Oct 20: The ambassadors of Muslim countries to Denmark have protested against 12 newspaper sketches of Holy Prophet Muhammad (pbuh) in a letter to Denmark's prime minister.

In a letter to Prime Minister Anders Fogh Rasmussen, diplomates from Arab Countries, Pakistan, Iran, Bosnia Hercegovina and Indonesia said they were offended by the sketches and demanded an official apology from the newspapers, the prime minister's office said.

Last week, as many as 5,000 Muslims demonstrated in Copenhagen against the paper and the sketches, which depicted the Holy Prophet in different settings.

We live in a democracy where satire and caricature are generally accepted, and religion should not set limits on that, chief editor Carsten Juste said.

یہ صورت حال تو کوپن ہیگن کی تھی۔ پاکستان میں حسن نثار کا کالم جو ۲۱ جنوری کے جنگ میں شائع ہوا ملاحظہ کیجیے۔اس کالم میں اکابرین اسلام اور ملت اسلامیہ کی کھلم کھلا توہین کی گئی۔

مغرب ہمیں اس لیے رگید رہا ہے کہ وہ علم اور عمل یعنی سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں ہم سے بہت آگے ہے۔علم سائنس اور عمل ٹیکنالوجی ہے اور یہی حکم خداوندی بھی ہے۔ہم نے ۱۲۷۳ء میں رومی پیش کیا۔مغرب نے ۱۲۹۴ء میں راجر زبیکن ہم نے ۱۶۲۴ء میں شیخ احمد سرہندی پیدا کیا تو انھوں نے ۱۶۳۰ء میں کپلر میدان میں اتارا، ہم نے ۱۷۳۹ء میں بہاؤ الدین نقش بندی سے فیض پایا وہ ۱۷۲۷ء میں نیوٹن سے فیض یاب ہوئے۔ہم ۱۸۹۹ء میں مہاجر مکی پر فخر کر رہے تھے، وہ ۱۸۸۲ء میں ڈارون پر متفخر تھے۔۱۸۳۱ء میں ہمارے پاس سید احمد شہید تھے تو ۱۸۱۹ء میں ان کے پاس جیمز واٹ تھے،۱۹۴۳ء میں ہمارا دامن حضرت تھانوی سے مالا مال تھا اور ۱۹۵۵ء میں ان کی جھولی آئن اسٹائن سے بھری ہوئی تھی۔[جنگ ۲۱ر جنوری ۲۰۰۶ء]

عالم اسلام کے اکابرین اور بزرگوں کی جس طرح توہین کی گئی ہے کیا اس کا تصور کیا جاسکتا ہے؟ یہ کالم پاکستان میں شائع ہوا لیکن کسی دینی مذہبی شخصیت حلقے سے اس توہین پر کوئی احتجاج نہیں ہوا، غیرت مندی کا لفظ شاید لغت سے خارج ہوگیا ہے یا آزادی اظہار رائے کے فلسفے نے ہماری غیرت کو محدود کر دیا ہے۔ بے چارہ کالم نگار اس بات سے ناواقف ہے کہ علم اور عمل کسے کہتے ہیں۔وہ دنیا کا طلب گار فرد ہے جس کا کام حکمرانوں کے قصیدے لکھنا اور دوری پر ہجو کہنا ہے۔اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ دنیا مل جائے اور دین نہ ملے تو یہ دنیا بھی غارت ہے اور وہ دنیا بھی لیکن دین کی نعمت ملے اور روٹی نہ ملے تو مغفرت ہوجائے گی۔قبر میں سوال روٹی، سائنس اور ٹیکنالوجی کا نہیں ہوگا۔ یہ ہوگا کہ تمہارا دین کیا ہے؟ علماء پاکستانی کالم نگار کو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ڈنمارک کے خلاف کے خلاف بہت کہہ رہے ہیں۔

عمان کے چار ہوٹلوں میں گزشتہ سال بم دھماکے،فلم Message کے ڈائریکٹر اور ہالی ووڈ کے فلم ساز مصطفیٰ عکاظ کو قتل کرنے کے لیے کئے گئے تھے یہ فلم ۱۹۷۴ء میں پاکستان لائی گئی لیکن شدید احتجاج کے بعد واپس لے لی گئی ۲۰۰۵ء میں جیو نے اسی فلم کو چلایا جس میں حضرت محمدؐ اور تمام صحابہ کی تصاویر دکھائی گئیں اس فلم پر ۱۹۷۴ء میں شور مچانے والے ۲۰۰۵ء میں خاموش رہے کیا فکر و نظر کے پیمانے بدل گئے ہیں یا جدیدیت نے پاکستانی دینی تحریکوں کا رخ بدل دیا ہے یا جنگ اور جیو میں نشر و اشاعت کی خاطر یہ سب گوارا

ہے۔۱۹۷۳ء میں فجر اسلام نامی فلم بنی تو علماء نے زبردست احتجاج کیا پھر رسالت مآبؐ کی حیات طیبہ پر فلم بنائی گئی اور اس فلم کی منظوری جامعہ ازہر اور شیعہ کونسل نے دی یہ فلم فارسی زبان کے علاوہ گیارہ زبانوں میں تیار کی گئی تھی اور اس کی منظوری جامعہ ازہر کے ساتھ ساتھ لبنان کی اعلیٰ شیعہ کونسل سے بھی لی گئی تھی اس کے فلم ساز بھی مصطفیٰ عکاظ تھے لیکن عالم اسلام نے ازہر اور شیعہ علماء کے فتاویٰ کے باوجود زبردست احتجاج کیا پاکستان میں یہ فلم نہ دکھائی جاسکی لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ دینی جماعتوں کی احتجاجی قوت ختم ہوگئی ہے یا وہ بہت لبرل ہوچکی ہیں اور Tolerance کے مغربی فلسفے کے تحت سب کچھ برداشت کررہی ہیں ڈنمارک میں اکتوبر میں ہزاروں مسلمان احتجاج کررہے ہیں نومبر میں ساحل توجہ دلا رہا ہے جنگ میں اداریہ شائع ہورہا ہے لیکن دینی حلقے خاموش ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ پاکستان میں سب سو رہے ہیں لیکن اچانک جاگ جائیں گے اور جاگنے کے مقاصد بھی سیاسی ہوں گے سیاست مقصد زندگی ہے لہٰذا ہر اصول اور نظریہ نذر سیاست ہوگیا ہے۔

کیا خدا کا فیصلہ غلط ہوسکتا ہے

اے ایف پی کی خبر ۶ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے مطابق امریکی صدر نے دعویٰ کیا تھا کہ عراق پر حملے کا حکم انھیں خدا نے دیا تھا:

I am driven with a mission from God.

عراق اور افغانستان پر حملہ کا دفاع کرتے ہوئے بش نے کہا تھا:

I have a moral and religious obligation.

اسی اسے ایف پی کی خبر مورخہ ۷ دسمبر ۲۰۰۵ء کے مطابق:

Washington Dec 7, In a rare acknowledgement that Iraq has not gone as planned, US. President George Bush agreed on Wednesday that mistakes had been made but warned that a US withdrawal now would be a bigger mistake. [AFP 8-12-2005]

ہمارا سوال صرف یہ ہے کہ کیا خدا کا فیصلہ غلط ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے خدا کا فیصلہ کبھی غلط نہیں ہوسکتا لہٰذا ثابت ہوگیا کہ عراق، افغانستان پر حملے کا حکم صدر بش کو خدا نے نہیں دیا، اگر یہ حکم خدا نے نہیں دیا تھا تو پھر کس نے دیا تھا؟ کیا یہ فیصلہ خواہش نفس کے تحت کیا گیا کیوں کہ قرآن نے خواہش نفس کو بھی خدا قرار دیا ہے۔ اس صدی میں خدائی کا یہ دعویٰ اور پھر تردید دعویٰ کے باوجود دنیا خاموش ہے؟ اس کا راز کیا ہے؟